سالوں میں جو مجھے یاد ہیں کتنے ہی مسرت کے' کتنے ہی دکھ کے لمحے گزرے ہیں۔ اس لمحوں کے بہاؤ کو میں کبھی بھول سکتی ہوں؟ اور اس کمرے کو جس کی کارنس پر کتنے ہی پھول سوکھ گئے اور کتنے ہی تازہ پھول ان کی جگہ رکھے گئے' پھول جو صرف میری خاطر' اس کمرے کی خاطر اگائے گئے اور کتنے ہی..... ارے یہ خاموشی کیوں ایک دم ہوگئی سارے میں' میرے ساز' میرے سازوں پر مٹی جم رہی ہے اور برآمدوں میں اتنی ویرانی سمٹ آئی ہے۔ میں ان کو یہاں لاکر رکھوں گی تاکہ وہ دل جائیں اور یہ خاموشی ٹوٹ جائے۔

اس نے سارے سازوں کے غلاف اتارے اور ایک ایک کرکے انہیں باہر لے آئی۔ طویل' اندھیری گیلری میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تان پورہ' ستار' وائلن' طبلہ' ہارمونیم..... کوئی ایک دیوار کے ساتھ' کوئی دوسری دیوار کے ساتھ' کوئی دروازے کے پاس' کوئی ریلنگ کے ساتھ۔ پھر دیر تک وہ ان کے درمیان پھرتی اور احتیاط سے ان پر انگلیاں دھرتی رہی۔ انہیں خاموش اور بے اثر پاکر اسے خوشی ہوئی۔ اندھیرے میں بھدی' سیاہ شکلیں' وہ دیوار کے سائے میں سوئے ہوئے فقیروں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

جب وہ بہت تھک گئی تو جاکر لکھنے کی میز پر بیٹھ گئی۔

''کسے؟ اب میں خط لکھوں گی۔'' لیمپ جلاتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا۔ ''کس کو؟..... کیا فرق پڑتا ہے۔'' سر کو ذرا سا جھٹکا دے کر اس نے لکھنا شروع کیا۔

UrduPhoto.com

صبح سے بارش ہو رہی ہے۔ طبیعت سخت اوب گئی ہے۔ آج نجمی کی سالگرہ تھی۔ تمہیں سب نے بہت یاد کیا۔ میں نے' نجمی نے' سب نے۔ ایلس بھی آئی تھی' لیکن وہ کسی کو یاد نہیں کرتی' وہ مجھے بھی کچھ نہیں بتاتی۔ بھلا بتاؤ کس قدر مسخرے پن کی بات ہے۔ اس میں کسی کا کیا قصور تھا۔ پر شیریں' وہ تو انگریز لڑکی ہے' کہتے ہیں یورپی اقوام سمجھدار ہتی ہیں اس معاملے میں اور پھر موت پر کسی کا کیا بس..... اللہ۔

شیریں آج میں نے شام کے سے کو اپنے اردگرد پھیلتے ہوئے دیکھا' محسوس کیا' تم نے کبھی کیا ہے؟ جب ذرا ذرا بارش ہو رہی ہو اور شام ہر طرف دھواں دھار ہو اور نیلی ہو اور بڑھتی جائے بڑھتی جائے۔ تو تم نے کبھی محسوس کیا ہے؟ ارے یہ ایسی خوبصورت شے ہے شیریں' نرم اور خوبصورت' اولیں بوسہ' یا اولیں سرگوشی یا..... ارے میں کیسے بتاؤں بھئی۔

اور کوریڈور' طویل اور خالی کوریڈور' زندگی سے اس قدر قریب ہیں۔ آج میں ان میں اس طرح پھرتی رہی جیسے کہ وہ میرے بہترین دوستوں میں سے تھے۔ ایک گیلری میں مجھے چند ساز پڑے ہوئے ملے جو سب کے سب خاموش تھے۔ ایک ستار ابھی تک ریلنگ پر جھکا ہوا ہے۔ جب اس پر بارش پڑے گی تو وہ ٹیون ہوگا؟ میں سوچتی ہوں۔

آج عمران بے حد اداس تھا۔ پرویز ابھی تک نہیں آیا۔ میرے خیال میں بچوں کو والدین کے پاس رہنا

چاہیے۔ نجمی آج سارا دن ننگے پاؤں بارش میں پھرتی رہی' مجھے ڈر ہے اسے زکام نہ ہو جائے۔ تمہارے بچے کیسے ہیں منو اور گڈو۔ حامد بھائی کی صحت کیسی ہے۔ شیریں ہم اس قدر تیزی سے بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم اور تم اور سب...... ایک بات بتاؤ شیریں: محبت کیا اتنا ہی دکھ دیتی ہے؟ کیا انسانوں کی یہی خطا ہے کہ وہ محبت کرتے ہیں؟''

آخری سطریں گھسیٹ کر وہ کرسی کی پشت پر گر گئی۔ 'یہ فرخندہ کے گیلے پاؤں کے نشان ہیں جو قالین پر پڑ گئے ہیں۔' وہ ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھ کر بیٹھی دیکھتی رہی۔ باہر بارش تیزی سے ہو رہی تھی۔

بارش کے شور سے خالہ کی آنکھ کھل گئی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ انہوں نے سر اٹھا کر کمزور آواز میں مہری کو پکارا جو انہیں کے کمرے میں سوتی تھی۔ وہ نیند میں بڑبڑا کر خاموش ہو رہی۔ خالہ بستر میں پڑی سنتی رہیں۔ بارش عجیب آواز سے ہو رہی تھی۔ پھر انہوں نے اٹھ کر باہر جھانکا۔ عذرا کے کمرے کے کھلے دروازے میں سے روشنی نکل رہی تھی۔ وہ خاموشی سے باہر نکل آئیں۔ برآمدے میں چلتے ہوئے وہ کسی شے سے ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچیں۔ ماحول میں خفیف سی جھنجھناہٹ پیدا ہوئی۔ ''مردار'' انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

عذرا کے دروازے میں وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ کھلے دریچے میں سے ہوا اور بارش اندر آ رہی تھی۔

''بی بی پاگل ہوئی ہو۔'' انہوں نے تیزی سے جا کر دریچہ بند کیا' کمبل اٹھا کر عذرا کے شانوں پر ڈالا اور قالین کو دیکھا۔ [illegible] یہ بھیگ [illegible] پانی پڑ رہا ہے اور آپ بھی بھیگ رہی ہیں۔ آدھی رات گئے۔''

عذرا کرسی سے اٹھی اور کمبل کو شانوں پر ٹھیک کر کے پھر بیٹھ گئی۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے عصابی لہجے میں کہا۔ پھر خالہ کو عجیب نظروں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر وہ گھبرا گئی۔

''بیٹھ جائیے۔'' اس نے پریشان تر لہجے میں کہا اور کاغذات الٹنے پلٹنے لگی۔ خالہ نے اس کے چہرے پر بہت کچھ پڑھ لیا۔ ''عذرا تم ایک بچے کی طرح ہو جو چوری کرتا ہوا پکڑا جاتا ہے۔ حالانکہ تم نہ بچہ ہو نہ تم نے چوری کی ہے۔'' خالہ نے پُرسکوت آواز میں کہا۔ ''ایسا کیوں ہے؟''

عذرا صرف خاموش' زخم خوردہ نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔ خالہ نے میز کا کونہ مضبوطی سے پکڑ لیا اور کھڑی رہیں۔ لمبی بیماری نے انہیں کمزور کر دیا تھا۔ سفید بالوں کی لٹیں ان کے کانوں پر بے ترتیبی سے لٹک رہی تھیں اور میز کا سہارا لئے کھڑی وہ بے کسی اور کسمپرسی کی تصویر نظر آتی تھیں۔ بارش دریچے کے شیشوں پر سر مار رہی تھی۔ دفعتاً وہ بہت دکھ سے بولیں: ''تمہاری عمر ڈھل رہی ہے..... اور تم ابھی نادان ہو۔''

عذرا نے دہل کر انہیں دیکھا۔ اس کا رنگ سنولا گیا اور ڈھلتے ہوئے چہرے کی لکیریں کانپنے لگیں۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ..... اپنے کمرے میں جائیں۔ آپ یہاں کیوں آئی ہیں۔''

خالہ بڑھاپے کے باوجود جذبے کی شدت سے کانپنے لگیں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ وہ ایک دوسرے کے

UrduPhoto.com

مقابل آن کھڑی ہوئی تھیں' اس مقام پر جہاں وہ محض دو عورتیں تھیں' ایک دوسرے کے لئے حقارت اور ترحم کے جذبات لئے ہوئے!

چند لمحوں تک وہ گستاخی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں۔ پھر عذرا کی بیکراں الم ناک نظروں کے سامنے خالہ ٹوٹ گئیں۔ میز کا کونہ پکڑے پکڑے وہ فرش پر بیٹھ گئیں اور رونے لگیں۔ عذرا کرسی پر بیٹھ کر کاغذوں کو دیکھنے لگی۔ دریچے کی درزوں میں سے پانی اندر آ رہا تھا۔ خالہ کی بلی ان کی قمیض کے دامن سے کھیل رہی تھی۔

جب خالہ نے آنکھوں پر سے ہاتھ اٹھایا تو اپنے آپ کو اسی طرح تنہا بیٹھے ہوئے پایا۔ دفعتاً اس وقت خالہ کو اپنے اور عذرا کے' اپنے اور اس دوسری عورت کے درمیانی فاصلے کا احساس ہوا' بُعد جو ان کے درمیان پیدا ہو گیا تھا۔

''تم..... کیا تم چاہتی ہو کہ روشن آغا اس غم میں ہلاک ہو جائیں اور......'' خالہ نے کہا ''اور میں یہاں سے چلی جاؤں؟''

''خالہ......'' عذرا نے تقریباً چیخ کر کہا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

خالہ نے دہشت سے دیکھا کہ وہ دوسری عورت ان سے زیادہ جوان' زیادہ مضبوط اور زیادہ سرد تھی۔ اس کی کھلتی ہوئی سرد نظروں کے سامنے خالہ لوٹنے پر مجبور ہو گئیں۔ ایک نامعلوم ندامت کے مارے انہوں نے جھک کر بلی کو اٹھایا اور [illegible] جب وہ [illegible] انہوں نے محسوس کیا کہ وہ عذرا کی زندگی سے بعید تر ہوتی جا رہی ہیں۔ بالآخر وہ ان سے الگ' ایک بالکل دوسری عورت تھی۔

جب وہ اکیلی رہ گئی تو بستر پر جا لیٹی۔ اس کے دماغ میں مکمل سناٹا تھا۔ گھبراہٹ کے باوجود اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ ایک ایسا گونگا بے تاثر چہرہ جس کا بوجھ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیٹے لیٹے اس نے محسوس کیا کہ کمرے میں ہوا کی شدید کمی تھی۔ اس نے اٹھ کر دریچہ کھول دیا اور کھڑے کھڑے اس کا چہرہ بھیگ گیا۔ وہ دوبارہ بستر پر لوٹ آئی۔ اب تھوڑے تھوڑے وقفوں پر سناٹا اس کے دماغ میں داخل ہونے لگا۔ لیکن ہوا پھر بھی نہ تھی' ہوا کی ایک رمق اس کے پھیپھڑوں میں نہ تھی۔ ایک دم بہت زیادہ گھبرا کر اس نے لمبے لمبے سانس لینے شروع کئے۔ اس کے حلق میں سے گرمی نکل رہی تھی اور زبان اکڑ گئی تھی۔ اس نے زبان کو تالو پر پھیرا۔ ہر سانس کے لئے اسے مشقت کرنا پڑ رہی تھی۔ مایوس ہو کر اس نے چیخنا چاہا لیکن آواز کہیں دور رہ گئی۔ اب اس کے کانوں میں شور مچ رہا تھا۔ کانوں میں اور دماغ میں اور ساری دنیا میں۔ اس کے پھیپھڑے بند ہو رہے تھے۔ یہ کیا ہے؟ یہ کون سا وقت ہے؟ اس نے کوشش کر کے سوچا اور مشکل مشکل سانس لیتی رہی۔ اس نے رونے کی ایک بے سود کوشش کی۔ صرف سانس کو جاری رکھنا اس وقت کا' اس لمحے کا اہم ترین کام تھا۔ سانس جو زندگی کا آخری نشان ہے۔ اسے جانکنی کا خیال آیا اور بہت زیادہ دہشت زدہ ہو کر اس نے سانس لینا جاری رکھا۔ لیکن اس کوشش میں اس کے سر میں سے پسینہ نکلنے لگا۔ سر میں سے اور پیشانی اور گردن اور چھاتی میں سے اور کمر اور ٹانگوں میں سے۔ وہ پسینے میں بھیگ گئی۔

انتہائی تکلیف کی حالت میں اس نے سر اور کندھوں کو دائیں بائیں ہلانا اور کراہنا شروع کیا۔

دیر تک وہ ادھ مرے سانپ کی طرح بستر پر تلملاتی رہی۔ جب تکلیف ختم ہوئی تو اس کے چہرے پر راکھ کے رنگ کی لکیریں گہری ہو چکی تھیں اور اس کے اندر کوئی شے' سرکش اور زور آور' ٹوٹ چکی تھی۔

بارش تھوڑی دیر کے لئے رک گئی تھی اور کمرے میں گیلے قالین کی بو پھیل رہی تھی۔

(۳۱)

سردیوں کا موسم گزر رہا تھا جب علی کو نعیم کے رہا ہو کر گاؤں پہنچنے کی اطلاع ملی۔ اسی رات کو اپنی بیوی سے مشورہ کرنے کے بعد وہ گاؤں کے لئے روانہ ہو پڑا۔ وہ اب وہاں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ وہ گاؤں واپس جا کر کھیتی باڑی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی ماں ایک سال ہوا مر چکی تھی اور زمینوں پر بڑی ماں (نعیم کی ماں) کا قبضہ تھا۔ چنانچہ اسے نعیم کی واپسی تک رکنا پڑا تھا۔

نعیم اور عذرا کا بڑا مکان برسوں سے بند پڑا تھا۔ اس کا باغ ویران ہو چکا تھا اور راستے گلے سڑے پتوں اور آندھی سے ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں سے ڈھکے پڑے تھے۔ گھاس میں جابجا بوڑھے پرندوں کی لاشیں پڑی ہوئی ملتی تھیں۔ ایک بوڑ[illegible] پچھلے پہر اس کی مرتی ہوئی دنیا کو دیکھتا اور نظر انداز کرتا رہتا تھا۔ اس روز بھی اس نے آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے دیوار کے ساتھ ساتھ گزرتے ہوئے علی کو دیکھا اور پہچان کر دھیان ہٹا لیا۔ وہ نعیم کا پرانا نوکر تھا لیکن علی کو پسند نہ کرتا تھا۔ علی نے آم اور امرود کے بہترین درختوں کو دیکھا جو ضائع ہو چکے تھے اور اس کے دل میں افسوس پیدا ہوا۔ اوپر کی منزل کی کھڑکیوں کے چند شیشے بھی ٹوٹ چکے تھے۔ گاؤں کے چاروں طرف تیزی سے پکتی ہوئی فصل کھڑی تھی۔ علی نے لمبا راستہ پکڑا جو مختلف کھیتوں کا چکر کاٹ کر گاؤں میں داخل ہوتا تھا۔ کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے وہ دونوں ہاتھ فصل پر پھیرتا رہا' یوں جیسے کہ وہ گائے کا نومولود بچھڑا ہو۔

مویشیوں کے احاطے میں علی کی بوڑھی بھینس اسے دیکھ کر خوشی سے ڈکرانے لگی۔ علی نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور جگالی کا جھاگ اس کے منہ سے صاف کرتے ہوئے سوچا' ''جانور نہیں بھولتے۔''

اندر نعیم اپنی ماں کے پاس بیٹھا کھا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر گرمجوشی سے اپنے بھائی کے ساتھ گلے ملا۔

''میں خود آنے کا ارادہ کر رہا تھا۔'' اس نے کہا اور اسے اپنے پاس بٹھا کر مکھن اور روٹی کھانے کو دی جسے علی غیر معمولی اشتہا کے ساتھ کھانے لگا۔ بوڑھی اسے دیکھ کر ہمدردی سے رونے لگی۔

مگر جب دوبارہ نعیم نے اسے دیکھا تو اسے صدمہ ہوا۔

''تم بہت کمزور ہو گئے ہو۔'' اس نے پوچھا۔

علی نے جھینپ کر اسے دیکھا اور بولا۔ ''تم بھی تو بوڑھے دکھائی دے رہے ہو۔''

''بوڑھے تو سب ہو جاتے ہیں پر جوان آدمی...... وہاں کھانے کو نہیں ملتا؟''

''خاص نہیں ملتا۔'' علی نے مختصراً کہا۔

کھانے کے بعد وہ باہر نکل آئے۔ دیر تک وہ مویشیوں کے درمیان پھرتے اور باتیں کرتے رہے۔ نعیم کے کہنے پر رکھوالا علی کو ہر ایک مویشی کی پچھلی پانچ سالہ زندگی کے حالات' جن میں اس کی بیماریاں' اس کی خوراک اور اس کا کام شامل تھا' مختصراً بتاتا جا رہا تھا۔ ان سے فارغ ہو کر وہ کھیتوں کو نکل گئے۔ ایک پہر تک وہ فصلوں میں گھومتے رہے۔ راستے میں ان کو کئی پرانے دوست ملے جنہوں نے رک کر دونوں بھائیوں کی خیریت پوچھی اور انہیں پھر سے اکٹھا دیکھنے پر خوشی کا اظہار کیا۔ نعیم نے عمداً اپنے بڑے گھر کی طرف جانے سے گریز کیا گو علی نے دو ایک دفعہ دبی زبان سے خواہش ظاہر کی کہ انہیں وہاں جا کر کم از کم پھلدار درختوں کی حالت کو دیکھ آنا چاہیے۔

واپسی پر نعیم نے پوچھا ''[illegible] کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے۔'' علی نے بتایا۔

سہ پہر کے وقت علی سو گیا۔ جب اٹھا تو شام پڑ رہی تھی اور نعیم کھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی ماں نے دونوں کے آگے بھنے ہوئے پرند اور گھوبھی کے سالن کا کھانا لا کر رکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کھانا شروع کرتے نعیم بولا۔

''میں [illegible]''

علی [illegible] سالن کی پلیٹ کو آہستہ آہستہ گھمانے لگا۔

''چھٹی لے کر آئے ہو؟''

علی پھر خاموش رہا۔

''بولتے کیوں نہیں؟''

''میں وہاں نہیں رہنا چاہتا۔ میں گھر آنا چاہتا ہوں۔'' علی نے کہا۔

نعیم نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی روٹی برتن میں رکھ دی۔ ''لیکن...... ہاں میں سمجھتا ہوں...... پر ابھی کچھ دیر تک تو تمہیں وہیں پر رہنا پڑے گا۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ ہمیں مزدوروں میں کام کرنا ہے۔ مزدوروں کی جماعت اس وقت ہندوستان کی بہت بڑی طاقت ہے۔ تمہیں پتا ہے؟''

علی کے ہاتھ' جو شوربے کی پلیٹ کو گھما رہے تھے' رک گئے۔

''تو اب...... میں بھی؟'' وہ غصے سے بولا۔ ''تم نے ہمیشہ میرے ساتھ دشمنی کی ہے۔ تم نے یہاں سے مجھے نکالا' اب مجھے جیل بھیجنا چاہتے ہو؟ تم خود جا کر جو مرضی ہو کرو۔''

نعیم اٹھ کھڑا ہوا اور پشت پر ہاتھ باندھ کر کمرے میں چکر لگانے لگا۔ ایک لوہے کا برتن اس کے پاؤں کی ٹھوکر سے اڑ کر شور مچاتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کی ماں آگ جلانا چھوڑ کر دم بخود بیٹھی تھی۔ دھواں چولہے میں

UrduPhoto.com

سے نکل نکل کر کمرے میں بھر گیا تھا اور آنکھوں کو لگ رہا تھا۔

ایک بار علی کے سر پر رک کر اس نے کہا۔ ”لیکن تم ہماری مدد کر سکتے ہو۔ خود اپنی خاطر...... احمق۔“ اور جواب نہ پا کر چل پڑا۔ علی نے قمیض کے دامن سے آنکھیں پونچھیں اور دبی زبان سے دھوئیں کو گالی دی۔

یکلخت نعیم غصے سے بولا: ”پھر تم یہاں نہیں آ سکتے۔ ادھر کا رخ بھی نہیں کر سکتے۔“

”میں وہاں بھی نہیں رہ سکتا۔ میں تنگ آ چکا ہوں۔“

”جاؤ......“ نعیم گرجا۔ ”جہنم میں جاؤ یا کہاں پر ابھی نکل جاؤ۔ جاؤ۔“

”جاتا ہوں۔“ علی آدھے قد سے اٹھ کر پھر بیٹھ گیا۔

”ابھی نکل جاؤ۔“ نعیم پھر گرجا۔

”جاتا ہوں جاتا ہوں۔ کھانا تو کھانے دو۔“

”بھاگ جاؤ سور۔ جہاں مرضی ہو جاؤ۔“ اس نے دروازے کی طرف ہاتھ لمبا کر کے کہا۔

”اچھا۔ اچھا......“ علی نے انتہائی غصے میں کہا اور بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔

روانگی کی تیزی میں اس نے اپنی بوڑھی بھینس کی لگاوٹ کو بھی نہ دیکھا جس نے اسے دیکھ کر کان کھڑے کر لئے تھے۔ [illegible] کر پانی میں چمکتے ہوئے تاروں اور درختوں کے عکس کو دیکھنے لگا۔ غصے کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں ایک زبردست رنج تھا جس نے اس کے دل کو مردہ پرندے کی طرح کر دیا تھا۔ خاموش اور ناطاقت۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں پر اس نے چند پتھر اٹھا کر پانی میں پھینکے۔ پھر قدموں کی آواز پر چونک پڑا۔ اندھیرے میں ایک ہیولا کمزور چال سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”علی......“ شام کے سناٹے میں نعیم کی آواز آئی جس میں نرمی تھی۔

”سوتنی کا جنا...... سوتیلا......“ اس نے دانت پیس کر کہا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

گھر پہنچ کر جب اس نے کھانا کھایا اور عائشہ کو ہر دم بک بک کرتے رہنے پر پیٹا تو اس کے دل پر ملامت کا سایہ گہرا ہو گیا۔ صبح سویرے کام پر جاتے ہوئے اسے عجیب احساس ہوا۔ وہی گلیاں‘ مکان‘ مل‘ وہی فیکٹری‘ مشینیں‘ دیواریں‘ وہی جگہ‘ وہی منظر‘ وہی لوگ جن سے وہ ہر روز ملتا تھا‘ ہر چیز‘ ہر شے اس قدر حوصلہ شکن طور پر یکساں اور ساکن اور غیر مبدل...... دفعتاً اس جگہ کی تنگی اور خوفناک حد بندی کا احساس بوجھ بن کر اس کے دل پر بیٹھنے لگا۔ وہ فیکٹری کے دروازے سے لوٹ آیا۔

(۳۲)

وہ کئی گھنٹے تک ریل کے سٹیشن پر آتے جاتے مسافروں' ریل گاڑیوں اور گدلی ہوتی ہوئی لائنوں کو دیکھتا پھرا۔ آخر تنگ آ کر شمال کی طرف جانے والی ایک ریل گاڑی میں سوار ہو گیا۔

سارا راستہ وہ ڈبے میں بیٹھا رہا۔ راستے میں کئی بار لوگوں نے کسان جان کر اسے نشست سے پیچھے دھکیل دیا اور خواہ مخواہ جھگڑا کرنے لگے اور دور کے مسافر اسے بھگوڑا سمجھ کر حقارت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آپس میں باتیں کرتے رہے لیکن وہ خاموش بیٹھا اپنے دل میں تازہ تازہ حاصل کردہ آزادی کے خوف کو پالتا رہا یہاں تک کہ' قریب تیس گھنٹے کے سفر کے بعد' ایک بڑے سے ڈھلکے ہوئے سٹیشن پر پہنچ کر گاڑی خالی ہونا شروع ہوئی۔ ٹکٹ دیکھنے کوئی نہ آیا۔ اس نے جوتا پہنا اور باہر نکل آیا۔ یہ لاہور کا سٹیشن تھا۔ وہ حیران رہ گیا۔

دیر تک وہ بنچ پر بیٹھا آتے جاتے مسافروں کو دیکھتا رہا۔ پھر بھوک محسوس کر کے اٹھا اور چائے کے کھیلے والے کے پاس پہنچا۔

"یہاں کیسے آئے ہو؟" چائے والے نے پوچھا۔

"ایسے ہی۔" علی نے چائے کی پیالی خالی کر کے [illegible] کہا۔

"نوکری کی تلاش میں ہو؟"

"ہاں۔"

"مل جائے گی۔ مل جائے گی۔" چائے والے نے تشفی کے لہجے میں کہا۔ "جب تک تم میرے پاس رک سکتے ہو۔ میں بھی دلی سے نوکری کی تلاش میں آیا تھا۔ یہاں آ کے کام شروع کر دیا۔ پھر یہیں پر جھونپڑا ڈال لیا۔ میری ماں ہے اور میں ہوں۔ بس پنجاب روزگار کے لئے اچھا ہے۔ جب تک کام نہ ملے جب تک جو مرضی آئے دے دینا۔ جب کام مل جائے گا جب جو مرضی آئے کرنا' الگ ہو جانا یا جو مرضی آئے ...... کیا کہا کہ کہاں کے رہنے والے ہو ایں؟"

تھوڑی دیر کے بعد وہ چائے والے کی تجویز پر شہر دیکھنے کی غرض سے چل پڑا۔ یہ شہر اسے اچھا لگا۔ یہاں کے لوگ موٹے تازے تھے اور دیہاتیوں کی طرح اونچی کرخت آوازوں میں باتیں کرتے تھے۔ وہ عمر میں پہلی مرتبہ اتنے بڑے شہر میں آیا تھا۔ رستے میں کئی جگہ پر وہ دلچسپی کی چھوٹی موٹی چیزوں کے پاس رکا۔ ایک کیمرے والا سڑک کے کنارے ایک دیہاتی کی تصویر اتار رہا تھا۔ ایک جگہ سرکس لگا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک گنے کھاتے ہوئے ہاتھی کے پاس کھڑا رہا۔ پھر ایک بیل گاڑی گزری جسے ایک کسان اور اس کی بیوی ہانک رہے تھے اور لاپروائی سے سڑک کے بیچوں بیچ چلے جا رہے تھے۔ علی نے ہاتھ بڑھا کر ایک بیل کا سر تھپتھپایا۔

ایک بازار میں داخل ہوتے ہوئے اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہاں پر لوگوں کے اجتماع میں وہ بدنظمی اور لاپروائی نہ تھی جو منظم شہری زندگی کی علامت ہوتی ہے۔ کاروبار معطل تھا اور لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں کھڑے ہراساں آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے درمیان پولیس کی ایک غیر معمولی تعداد نظر آ رہی تھی۔ ایک دکان پر ایک آوارہ بیل کھڑا کپڑے کے تھان کو چبا رہا تھا۔ لوگوں کے چہروں سے رونق غائب تھی۔ بظاہر وہ پُرامن طریقے پر کھڑے تھے مگر ایسا ہراساں اور چپ چاپ امن جس سے بدامنی کا خدشہ پیدا ہوتا تھا۔ علی جلد جلد ان کے درمیان سے گزر گیا۔ صرف بیل کے قریب سے گزرتے ہوئے یہ دیکھ کر کہ وہ خصی جانور تھا' اسے رنج ہوا اور اس نے ان لوگوں کو' جو اس حرکت کے ذمہ دار تھے' دل میں گالی دی۔ وہ ہمیشہ سے ان خودغرض لوگوں کے خلاف تھا جو زیادہ کام لینے کی خاطر بیلوں کو خصی کروا دیتے تھے۔

اگلے بازار میں بھی اسے اس آفت سے چھٹکارا نہ ملا۔ یہ بازار تو گویا ساری چیز کا مرکز تھا۔ لوگ وہاں باقاعدہ جلوس کی شکل میں دونوں طرف جمع تھے۔ ان کے بیچوں بیچ چند بارعب لوگ' جو رضاکار معلوم ہوتے تھے' ہاتھوں میں معمولی ہتھیار مثلاً لاٹھی' بلّم یا تلوار لئے سیدھی قطاروں میں کھڑے تھے۔ ایک شخص خاکی وردی میں ملبوس ہاتھ میں بلّم اٹھائے ان قطاروں کے سرے پر یوں کھڑا تھا جیسے ابھی ابھی تقریر کر چکا ہے۔ ہجوم سے دبے دبے نعروں کی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ علی نے خطرہ محسوس کر کے وہاں سے گزر جانا چاہا۔ جب وہ ہجوم میں سے گزر رہا تھا تو چند پولیس کی گاڑیاں آ کر رکیں اور ان میں سے چند انگریز افسر اور سپاہی کود کود کر برآمد ہوئے۔ اس کے دیکھتے دیکھتے ایک انگریز افسر نے آگے بڑھ کر سرے والے بلّم بردار سے کوئی بات کی۔ اس نے جواب میں انگریز افسر کے منہ پر زور کا طمانچہ مارا۔ انگریز نے پیچھے کود کر ریوالور نکالا اور ایک فٹ کے فاصلے سے گولی چلا دی۔ گولی اسے آنکھوں کے درمیان لگی اور وہ گر پڑا۔ لیکن اس سے پہلے کہ افسر سنبھلتا عقب سے کسی نے اس کے پہلو میں بلّم چبھو دی۔ وہ ریوالور پھینک کر بلّم کے دستے پر جھک گیا۔ پیچھے سے دوسرا انگریز افسر جو بھاگا آ رہا تھا رک گیا اور ریوالور ہوا میں لہرا کر چلایا۔ ''فائر..... فائر۔''

مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ چشم زدن میں بازار گولیوں کے خشک دھماکوں اور بارود کی بُو سے بھر گیا۔ منظم رضاکار' جن میں بھگدڑ نسبتاً کم تھی' کود کود کر اور چکر کھا کھا کر گر رہے تھے۔ علی کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ پھر بھاگتے ہوئے ہجوم کے دھکوں کے ساتھ وہ بھی بھاگنے لگا۔ پھر ایک زخمی سے ٹھوکر لگنے پر دور تک لڑھکتا ہوا چلا گیا' پھر چلا کر اسے کوسا اور چھلانگ لگا کر ایک زینے پر چڑھ گیا اور بے تحاشا دروازہ پیٹنے لگا۔ پل کے پل کو مڑ کر اس نے تیزی سے گزرتی ہوئی زرد' خوفزدہ شکلوں اور موت کا ناچ ناچتے ہوئے لوگوں کو دیکھا' پھر اونچی روتی ہوئی آواز میں گالی دے کر دھڑا دھڑ پیٹنے لگا۔ دروازہ کھل گیا۔ علی کے دھکے سے دروازہ کھولنے والی عورت لڑکھڑا کر زینے پر جا پڑی۔

وہ ایک معمولی شکل وصورت کی عورت تھی جس کی جوانی ڈھل رہی تھی۔ علی گھبراہٹ میں کافی دیر تک چٹخنی بند کرنے کی کوشش کرتا اور منہ میں بڑبڑاتا رہا۔ اچانک عورت نے بڑے لاپرواہ انداز میں گالی دی اور اس کا ہاتھ

UrduPhoto.com

جھٹک کر چٹخنی بند کر دی۔

''چلو۔'' اس نے اسی بیزار لہجے میں کہا اور علی کو آستین سے پکڑ کر زینے میں دھکیل دیا۔

آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دونوں اوپر آ گئے۔ چھوٹے سے کمرے میں پہنچتے ہی علی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ عورت کھڑکی کی درز میں سے نیچے کا نظارہ کرنے لگی۔ انسانی چیخوں اور گولیوں کے چلنے کی آوازیں لگاتار آ رہی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ ہاتھ پشت پر باندھ کر کمرے میں چکر لگانے لگتی۔ اس کا چہرہ زرد مگر بے خوف تھا۔

''چوہوں کی طرح مر رہے ہیں۔'' ایک دفعہ رک کر اس نے زیر لب کہا اور حقارت سے علی کو دیکھا۔ اس کے چلنے کے انداز سے بے حیائی اور مردانہ پن ظاہر تھا۔ علی خاموش بیٹھا حیرت اور خوف کے ملے جلے احساس کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔ آہستہ آہستہ گولیوں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ کبھی کبھی دور و نزدیک سے ایک آدھ فائر ہوتا اور پھر سناٹا چھا جاتا' سناٹا جو زخمیوں کی کراہوں کی وجہ سے شدید ہوتا جا رہا تھا۔ عورت مڑی اور باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ تمسخر' کچھ حقارت سے بولی۔

''تم وہاں پر مرتے پڑے ہوتے۔ اب الّو کی طرح مست بیٹھے ہو۔ آ کر دیکھو آؤ۔''

علی خوف سے ہلتا ہوا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ یکلخت عورت نے دھکا دے کر اسے پیچھے ہٹایا اور کھڑکی بند کر دی۔ نیچے کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا۔ پھر ایک دم بہت سے ہاتھ دروازے پر پڑنے لگے۔ عورت علی کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی [illegible] غائب ہو گئی۔ آدھے رستے میں رک کر اس نے دیوار میں سے ایک تختہ ہٹایا اور علی کو دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر اس میں دھکیل دیا۔

''جاؤ۔ اندر جاؤ..... چلو۔''

جب وہ اندر گھس کر بیٹھ گیا تو عورت نے تختہ اپنی جگہ پر برابر کیا اور واپس آ کر زینے کے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ پھر اس نے جا کر بازار والا دروازہ کھول دیا۔ پولیس اور فوج کے سپاہی رائفلوں کے دستے بجاتے اوپر چڑھ آئے۔

''کہاں ہے؟'' ایک پنجابی سپاہی نے پوچھا۔

''کون؟''

''تیری ماں کا یار۔''

''یہاں کوئی نہیں ہے۔''

ایک سکھ سپاہی نے ڈنڈا گھما کر عورت کے چوتڑوں پر مارا۔ اس نے بلبلا کر گالی دی۔

''بتا کہاں گیا؟''

''یہاں بس میں رہتی ہوں۔ مجھے پتا نہیں۔'' عورت چوتڑ ملتے ہوئے بولی۔

''بتا.....'' پنجابی سپاہی خوفناک گالیاں بکتا ہوا چیخا اور اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا دوسری دیوار تک

نے کہا۔ عورت ہوا میں ہاتھ چلانے لگی۔

"بتا رنڈی..." سپاہی نے اس کے بال بازو پر لپیٹتے ہوئے کہا۔ عورت نے چیخ مار کر ناخن سپاہی کی ران میں گاڑ دیے۔ سپاہی نے ٹانگیں جھاڑ کر فوجی بوٹوں کی ایک زوردار ٹھوکر عورت کی کمر میں ماری۔ "بول... رنڈی۔"

واحد گورا سپاہی' جو سٹین گن کندھے سے لٹکائے خاموش کھڑا تھا' آگے بڑھا اور عورت پر جھک کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں نرمی سے بولا: "ٹھیک ٹھیک بولو... رنڈی۔"

عورت نے تڑپ کر سر اٹھایا اور گالیوں کی بوچھاڑ اس کے منہ سے نکلی: "ہاں میں رنڈی ہوں... میں ہوں۔ ٹھیک ہے۔ یہاں ہر کوئی آ سکتا ہے۔ مجھے پتا نہیں یہاں کون کون ہے۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔"

گورا سپاہی برا سا منہ بنا کر پیچھے ہٹ آیا۔ پھر اس کے پیچھے پیچھے آدھے سپاہی دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں وہ الماریاں اور صندوق کھول کھول کر دیکھتے رہے۔ پھر چارپائیوں کے نیچے' کھڑکیوں کے باہر اور چھت بجا بجا کر دیکھنے کے بعد زینے کا دروازہ کھول اندھیرے میں اتر گئے اور نیچے پہنچ کر انہوں نے گلی کا دروازہ کھول کر دیکھا' اسے بند کیا اور لوٹ آئے۔

جب وہ پچھلے کمرے میں پہنچے تو سپاہی عورت کے بالوں کو سانپ کی طرح بازو پر لپیٹے اس کی چھاتیاں مروڑ رہا تھا۔ عورت کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید تھا۔

"نہیں... بتا... چپ"

"نہیں اسے پتے..."

اس کی کلائی میں عورت نے دانت گاڑ دیے تھے۔ سپاہی نے دونوں ہاتھ چھڑائے اور پیچھے کود کر پوری قوت سے اس کے شانوں کے درمیان بوٹ کی ٹھوکر ماری۔ اس کی کلائی سے خون بہہ رہا تھا۔ پھر انہوں نے مارنا شروع کیا۔

جب تک وہ اپنے پاؤں پر قائم رہی وہ گھونسوں' بوٹوں اور رائفلوں کی ضربوں سے اسے ایک سے دوسری دیوار کی طرف اچھالتے رہے۔ جب وہ فرش پر ڈھیر ہو گئی تو انہوں نے اس کا لباس پھاڑ ڈالا اور پیٹھ اور چھاتی پر ڈنڈے مارنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد تھک کر انہوں نے پیٹنا بند کر دیا اور اس مردہ ڈھیر کے اردگرد خاموش کھڑے ہو کر خالی نظروں سے کمرے میں دیکھنے لگے۔ وہ یکلخت پشیمان ہو گئے تھے اور اس بے جان انسانی جسم کو جس سے انہیں کچھ بھی حاصل نہ ہوا تھا' دیکھنے سے احتراز کر رہے تھے۔

"بیکار ہے۔" آخر گورے سپاہی نے بے حد اکتا کر کہا اور سیڑھیوں کی جانب لپکا۔ اس کے پیچھے پیچھے سب اتر گئے۔

جب علی کو دیوار سے کان لگائے بیٹھے کافی دیر ہو گئی اور کوئی آواز نہ آئی تو اس نے احتیاط سے تختہ ہٹایا اور سیڑھیوں پر کود گیا۔ مکان میں گہرا سناٹا تھا۔ اوپر والے دروازے میں ایک بلی کھڑی تھی جو اسے دیکھتے ہی

UrduPhoto.com

بھاگ گئی۔ پہلا کمرہ خالی تھا۔ دوسرے کمرے کے فرش پر اس کا ننگا جسم بے حس و حرکت پڑا تھا اور ٹانگیں بے شرمی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ششدر کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر بھاگ بھاگ کر دروازے اور کھڑکیاں بند کرنے لگا۔ ننگے جسم پر ضربوں کے نشان تھے۔ علی نے اسے اٹھا کر دیوار کے سہارے بٹھایا لیکن وہ لڑھک گئی۔ کافی دیر تک وہ اسے ہوش میں لانے کی بے سود کوششیں کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ وہ خود بخود ہوش میں آ گئی۔

سب سے پہلی نظر اس نے اپنے آپ پر ڈالی اور جسم کو بازوؤں میں چھپا لیا۔ علی نے بستر پر سے چادر کھینچ کر اسے اڑھا دی۔ وہ خاموشی سے چادر لپیٹتی اور ارد گرد دیکھتی رہی۔ پھر اس نے خون آلود ہونٹوں پر زبان پھیر کر علی کی طرف دیکھا۔ علی نے بھونڈے پن سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ دفعتاً وہ اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ اس کے آنسو پونچھتا اور پیار سے سارے جسم پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر اس نے اس کے گالوں اور آنکھوں کو چوما۔

تھوڑی دیر کے بعد علی نے اسے بازوؤں میں بھر کر اٹھایا اور لے جا کر چارپائی پر لٹا دیا۔ بازو پر سر رکھے وہ دیوار کو دیکھتی رہی پھر نقاہت کے مارے اونگھنے لگی۔ جب اس نے آنکھ کھولی تو علی دیوار کے ساتھ بیٹھا اسے تکے جا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اب میں ٹھیک ہوں۔" وہ اداسی سے مسکرائی۔

"تم لیٹی رہو۔"

"اچھا ہوا تم نہیں آئے۔ وہ تمہیں قتل کر دیتے۔"

علی چارپائی کے پائے پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف جھکا۔ "تم سمجھتی ہو میں بزدل ہوں؟"

"اوہ نہیں۔" وہ ہنسی۔

"گاؤں میں لوگ کہتے تھے کہ شہر میں رہ رہ کر میں بزدل ہو گیا ہوں۔" علی نے اداسی سے کہا۔

"ارے نہیں پگلے۔" وہ پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں ڈال کر ہنسی۔ "تم نے کھانا نہیں کھایا۔"

"نہیں نہیں، تم بیٹھی رہو۔"

"اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے کہا اور چادر لپیٹتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جب وہ اس کمرے سے برآمد ہوئی تو اس نے سفید ریشم کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا منہ دھلا ہوا اور بال سنورے ہوئے تھے۔ وہ خاموشی سے مسکراتی ہوئی جا کر سبزیاں نکالنے لگی۔

"میں آگ جلا دوں؟" علی نے پوچھا۔

"تم بیٹھے رہو۔ میں سب کام کر لوں گی۔"

وہ کمرے میں پھرنے لگا۔ بازار والی کھڑکی ذرا سی کھلی تھی۔ باہر موت کا سناٹا تھا اور چند آوارہ کتے ادھر ادھر پڑی ہوئی لاشوں کو سونگھ رہے تھے۔ وہ وہاں سے ہٹ آیا۔ الماری میں بچی کچی سبزیاں اور کچھ باسی اشیائے

خوردنی پڑی تھیں۔ اس نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا جو چولہے کے آگے سمٹی سمٹائی بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ وہ اسے بڑی پیاری لگی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''زہرہ۔ زہرہ بیگم۔''

''اچھا اچھا'' وہ خوشی سے سر ہلا کر بولا۔ ''میرا نام علی ہے۔''

دونوں نے وہیں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد علی چارپائی پر لیٹ گیا۔

''یہاں آ جاؤ۔''

وہ اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھی۔

''تم بڑی مضبوط ہو۔'' علی نے اس کا جسم ٹٹولتے ہوئے کہا۔

''ضربوں نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔''

''ہاں'' وہ ہنسی۔ ''مضبوط تو تم بھی ہو' صرف ذرا بزدل ہو۔''

''اے'' علی نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنی طرف کھینچنا چاہا۔

''ارے......'' وہ کڑی نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی سمٹ کر پرے ہو بیٹھی۔

علی [illegible]

''تم گاؤں میں رہتے ہو؟'' عورت نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''ہم بھی گاؤں میں رہتے تھے۔''

''اچھا؟ کہاں؟''

''ہمارا گاؤں امرتسر کے قریب تھا۔''

''اب کہاں گیا؟''

''اب بھی ہے۔ لیکن میں وہاں نہیں جاتی۔''

''کیوں؟''

''جب میرا باپ مر گیا تو ہم نے گاؤں چھوڑ دیا۔''

''تمہاری زمین بھی تھی؟''

''پتا نہیں۔ تب میں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے ذرا ذرا یاد ہے۔ بس اتنا کہ میں بھینس کی پونچھ پکڑ کر جوہڑ میں تیرا کرتی تھی اور ایک دفعہ جب میرا باپ گرد سے اٹا ہوا شہر سے لوٹا اور مجھے گھوڑے کی رسی پکڑا کر گھر کے اندر چلا گیا تو گھوڑا میرے آدھے بال کھا گیا اور میں ساری رات روتی رہی تھی۔ اور میرا باپ تھا جو بڑا جوان' بڑا نرم

دل اور بڑا خوبصورت تھا۔ اس کے بعد میں نے کوئی خوبصورت آدمی نہیں دیکھا۔'' علی کو اس کی آواز ڈوبتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ''تمہیں بھی بہت بچپن کی کوئی بات یاد آتی ہے؟''

''ہاں۔'' وہ ہنسا۔ ''اررر...... سب سے پہلی بات یہ یاد آتی ہے کہ میرے باپ کے پاس تین دودھ دینے والی بھینسیں تھیں اور سویرے سویرے جب میری ماں مکھن نکال لیتی تھی تو ہمسایوں کے بچے اپنے اپنے برتن لے کر لسی لینے آیا کرتے اور دروازے میں کھڑے ہو کر دانت نکوسا کرتے تھے۔ میری ماں ایک ایک کو بلا کر چھاچھ دیتی تھی۔ ان میں زیادہ تر لڑکیاں ہوتی تھیں اور جب وہ بھرے ہوئے برتن اٹھائے مویشیوں والے احاطے میں سے گزرتیں تو میں بلاوجہ ان کو مارا اور ان کی چوٹیاں کھینچا کرتا تھا۔''

''کمینے۔'' وہ چلائی۔ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

انتہائی اعصابی کوفت کے بعد پیٹ بھر کھانے اور تھوڑے سے سکون نے علی پر غنودگی طاری کر دی اور وہ عورت کی گود میں ہاتھ رکھے رکھے سو گیا۔ وہ محبت سے اسے دیکھتی اور لمبے لمبے گہرے گہرے سانس لیتی رہی۔ پھر اس نے آہستگی سے علی کا ہاتھ بستر پر رکھا اور کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر ایک لمبی انگڑائی لی۔ انگڑائی کے درمیان وہ چونک کر رک گئی اور بازو لٹکا کر پریشانی سے چاروں طرف دیکھنے لگی' یوں جیسے مہربان دوستوں میں بیٹھ کر قہقہے لگاتے لگاتے ذہن پر سے کسی ناخوشگوار خیال کا سایہ گزر جائے۔

جب [illegible] ایک بچہ [illegible] آئی تھی۔

''یہ کون ہے؟''

''میری بیٹی کا بچہ ہے۔''

''تمہارا کوئی بچہ نہیں؟''

''یہ سب کا بچہ ہے۔''

''سب کا؟''

بچہ صحت مند اور چلبلا تھا۔ علی نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ بھاگ کر عورت کے کندھوں پر جا چڑھا۔

''اب گھوڑا بنو۔ مجھے بلایا کیوں تھا۔ اب گھوڑا بنو۔'' بچے نے رٹ لگائی۔ وہ ہنستے ہنستے دہری ہوئی جا رہی تھی۔

''یہ دیکھو' تمہارا گھوڑا یہ بنے گا۔'' عورت نے علی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''یہ کون ہے؟'' بچے نے پوچھا۔

''بوجھو۔''

''ابا ابا......'' وہ تالیاں بجاتا ہوا چلانے لگا۔

علی کو بچے پر بے حد پیار آیا۔ وہ چارپائی سے اتر کر فرش پر گھوڑا بن گیا۔

''آؤ..... آؤ۔''

بچہ ڈرتے ڈرتے جا کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ اب وہ دیواروں کے ساتھ ساتھ سارے کمرے میں چل رہا تھا اور عورت ہنستے ہنستے بیر بہوٹی بنتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اچھلنے اور گھوڑے کی بولی بولنے لگتا تو بچہ خوشی سے تالیاں بجاتا۔ آخر کار عورت نے کھینچ کر اسے علی کی پیٹھ سے اتارا اور گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ وہ باتیں کرنے لگے۔ گاؤں کی باتیں، شہر کی باتیں۔ علی نے اسے اپنے کام کے متعلق بتایا جو اسے قطعی پسند نہ تھا اور صبح کا واقعہ جس کے متعلق عورت نے بتایا کہ بازار کے آخیر پر زمین کا ایک قطعہ تھا جو مسجد (شہید گنج) کے لئے وقف تھا اور جس پر سکھ اپنا حق جتا کر گوردوارہ بنانا چاہتے تھے۔ اس طرح وہ جو مدت سے جھگڑے کا سبب بنا ہوا تھا آج صبح کے سانحے پر ختم ہوا۔ پھر انہوں نے گھر باہر کی باتیں کیں۔ معمولی معمولی ذاتی باتیں جو ایک ہی گھر کے افراد یا قریبی دوست آپس میں کرتے ہیں۔ باتوں کے دوران دو ایک مرتبہ علی نے اسے اپنی طرف کھینچنا چاہا لیکن اس نے سرد مہری سے اسے روک دیا۔ باتیں کرتے کرتے شام پڑ گئی۔ بچہ ان کے پاس سے اٹھ کر جا چکا تھا۔

اس وقت دوسرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ عورت دروازے میں کھڑی ہو کر دستک دینے والے سے جو کواڑ کی اوٹ میں تھا، باتیں کرنے لگی۔ دیر تک سرگوشیوں میں تُو تُو مَیں مَیں کرتے رہنے کے بعد وہ اونچی آواز میں گالی دے کر بولی: ''اس آفت کے وقت میں بھی.....'' اور دروازہ بند کر کے علی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''اب تم جاؤ۔''

علی حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

اس نے ندامت سے کپڑے جھاڑے اور ادھر اُدھر دیکھتی ہوئی بولی: ''اب تم جاؤ، کل پھر آنا۔''

''کہاں؟ کہاں جاؤں؟''

''کہیں بھی جاؤ۔ چلو اٹھو۔'' اس نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور سیڑھیاں اترنے لگی۔

آدھے رستے میں علی نے اسے روکا۔ ''لیکن..... پچھلی طرف سے نکالو۔ ادھر پولیس ہے۔''

''اس وقت اندھیرا ہے۔ کوئی نہیں دیکھے گا۔ چلو.....''

آخری سیڑھی پر رک کر اس نے دونوں ہاتھ علی کے کندھوں پر رکھ دیئے اور دھیرے سے بولی: ''کل پھر آنا۔''

''میرا یہاں کوئی نہیں۔ مجھے یہیں رہنے دو۔''

''اوں ہنک.....''

''میں تمہارے ساتھ نہیں سوؤں گا۔'' علی نے منت کی۔ ''فکر نہ کرو۔''

''نہیں اب تم کل آنا۔ پھر پرسوں آنا۔ پھر ہر روز آیا کرنا، پھر.....'' وہ ہنسی۔

اندھیرے میں اس کے گہرے جذباتی قہقہے کی آواز علی کو بھلی معلوم ہوئی۔

''اب جاؤ.....'' اس نے دروازہ کھول کر علی کو باہر دھکیل دیا۔

UrduPhoto.com

وہ اندھیرے میں کھڑا اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھتا رہا۔

"جاؤ....."

"تو ٹھیک ہے۔ اب میں نہیں آؤں گا۔"

"نہیں بھی ضرور آنا۔ تمہاری منت کرتی ہوں۔"

"کتیا۔" علی نے کہا۔ "اب تھوکنے بھی نہیں آؤں گا۔"

کئی لمحوں تک وہ اندھیرے میں چپ چاپ کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر عورت کی بھری ہوئی آواز آئی جس میں وہی پہلے والی عریانی اور لاپروائی تھی۔

"حرامی۔ تم اس وقت چوہے کی طرح مرے پڑے ہوتے۔ وہاں۔" اس نے گالی دے کر دروازہ بند کر دیا۔

علی نے انتہائی غصے میں دو تین لاتیں بند دروازے پر جمائیں اور سانپ کی طرح پھنکارا۔ "رنڈی۔"

بازار میں سپاہیوں کے بھاری بوٹوں کی آہٹ پیدا ہوئی۔ وہ دوڑ کر ایک دکان کے نیچے گھس گیا۔ اس وقت اس نے دھل کر دیکھا کہ وہ ایک مرے ہوئے آدمی پر بیٹھا تھا۔ سپاہی خاموشی سے گزر گئے۔

باہر نکل کر وہ کچھ دیر کانپتی ہوئی ٹانگوں پر وہیں کھڑا رہا۔ اس کا دل سُن ہو چکا تھا۔

UrduPhoto.com

(۳۳)

سردیوں کے آغاز میں نعیم پر فالج کا حملہ ہوا۔ حملہ زیادہ شدید نہ تھا۔ گاؤں کے حکیم نے یقین دلایا کہ کوئی بات نہیں' سردیوں میں گھوڑے بھی اکثر جڑ جایا کرتے ہیں اور دو ایک گیدڑ پکا کر کھلانے پر بھلے چنگے ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ چارپائی سے جا لگا۔

دو ہفتے بعد یہ خبر عذرا نے منشی کی زبانی سنی جو لگان کے سلسلے میں روشن محل گیا ہوا تھا۔ دن بھر وہ کمرے میں پڑی رہی۔ سہ پہر کے وقت باغ میں اتر آئی۔ خزاں کی زرد ہوائیں چل رہی تھیں اور روشوں پر گرے ہوئے پتے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ وہ برگد کی جڑ پر چڑھ کر بیٹھ گئی اور خشک پتوں کی ڈھیری بنانے لگی۔ کبھی کبھی دفعتاً بے چین ہو کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی۔ پھر اس کنفیوژن سے گھبرا کر اٹھی اور اگلے درخت کی جڑ پر جا بیٹھی۔ وہاں بھی وہ آسانی کے ساتھ توازن قائم کر کے بیٹھی پتوں کو ہوا میں اڑاتی رہی۔ اس نے موسم کے شدید حسن کو بھی محسوس نہ کیا۔

اگلے روز وہ روشن پور پہنچی۔ گاؤں اسی طرح پرانا اور گرد آلود تھا۔ وہی دیواریں اور درخت اور گلیاں' وہی کھیت جن میں اکا دکا کسان ہل جوت رہے تھے۔ یہ بیائی کا موسم ہے۔ اس نے ذہن پر زور دے کر سوچا۔ اس برسوں پرانے' خوابیدہ منظر کو دیکھ کر وہ بے طرح اداس ہو گئی۔ اپنے گھر میں داخل ہو کر اس نے بوڑھے رکھوالے کا حال پوچھا۔ بڈھا چابیوں کے گچھے کو ٹٹولتا ہوا اس کی غیر متوقع آمد پر خوشی اور رنج کے ملے جلے جذبات کے مارے

رونے لگا۔ نوکروں کو مکان کھولنے کا حکم دے کر وہ باورچی خانے میں جا بیٹھی۔ مکان میں سے دروازوں' کھڑکیوں کے کھلنے اور جھاڑنے پھٹکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ فرنیچر گھسیٹا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی ایک آدھ شیشہ ٹوٹتا اور نوکروں کے باتیں کرنے کی آوازیں آتیں۔ یہ موسم خزاں کا ایک شفاف دن تھا اور باورچی خانے میں دھوپ بھری ہوئی تھی۔ عذرا کھڑکی میں کھڑی گرد و غبار کے اس چھوٹے سے بادل کو دیکھتی رہی جو کمروں میں سے نکل کر دھوپ میں آ گیا تھا' وہ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہی تھی' اب جبکہ وہ یہاں پہنچ چکی تھی یہاں سے باہر قدم رکھتے ہوئے ڈر رہی تھی۔

''اب؟'' اجاڑ باغ کے ٹوٹے پھوٹے راستوں پر چلتے ہوئے اس نے ہزارویں بار دل میں سوار کیا۔ وہی ژولیدگی' وہی بے اطمینانی ہر جگہ اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

جب اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا تو وہ چوروں کی طرح نعیم کے گھر میں داخل ہوئی۔ مویشیوں کے احاطے میں نعیم کی ماں لکڑی کی بالٹی میں دودھ دوہ کر اندر لے جا رہی تھی اور کچی منڈیر پر شام کا ستارہ جھلملا رہا تھا۔ وہ اس گھر میں پہلی بار داخل ہو رہی تھی۔ وہ یہاں کبھی نہ آئی تھی۔ اس نے نعیم کی ماں کو صرف ایک بار دور سے دیکھا تھا۔ یہ گھر اس کے خوابوں کے جزیرے پر کہیں بھی واقع نہ تھا۔ یہاں آنے کے بارے میں اس نے کبھی نہ سوچا تھا۔ آج اجنبیوں کی طرح اس گھر میں قدم دھرتے ہوئے اس کے دل میں علیحدگی' اس قدیم بیگانگی کا احساس تک پیدا نہ ہوا کہ لاشعوری قوتیں اس قدر طاقت ور ہوتی ہیں۔ بے آواز قدموں سے احاطہ پار کر کے اس نے اندر جھانکا۔ کھاتے پیتے کسانوں کے گھر کا ایک سماں تھا۔ باورچی خانے میں بڑھیا کام کر رہی تھی۔ جب وہ کھڑکی کے سامنے سے گزرتی تو اس کا سایہ صحن میں پڑتا۔ کمرے کے دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا اور چارپائی پر لیٹے ہوئے مرد کی ٹانگیں نظر آ رہی تھیں۔

''نعیم.....'' عذرا نے کپکپا کر سوچا۔ وہ انگور کی بیل کے نیچے اندھیرے میں دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھے کھڑی رہی جیسے نادار لوگ خوراک کی امید میں سر شام متمول کسانوں کے دروازوں پر چپ چاپ آ کھڑے ہوتے ہیں۔

پھر اس نے بلی کی طرح چل کر صحن پار کیا۔ نعیم چہرے کے آگے کتاب رکھے لیمپ کی روشنی میں پڑھ رہا تھا۔ آہٹ سن کر بچوں کی طرح بولا۔

''ماں مجھے بھوک لگی ہے۔ مالش پھر کراؤں گا۔''

کوئی جواب نہ پا کر اس نے کتاب ہٹائی۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور کتاب نیچے گر پڑی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کہنی کے بل صرف آدھا اٹھ سکا۔ اس کا ماتھا آدھے سر تک جا چکا تھا اور کنپٹیوں پر سفید بالوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ عذرا دروازے کو تھامے کھڑی رہی۔ اس نے دیکھا کہ نعیم کی آنکھوں میں بے پناہ مظلومیت تھی۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور وہ اس کی چارپائی کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

''عذرا.....'' آخر کار نعیم بڑبڑایا اور دھم سے تکیے پر گر پڑا۔ کچھ دیر تک وہ سیدھا لیٹا آنکھ جھپکے بغیر خلا میں

UrduPhoto.com

دیکھتا رہا۔ پھر یکایک اس نے کروٹ بدلی اور بازو عذرا کی گردن میں ڈال کر اپنی طرف کھینچا۔ وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ محبوب آنکھوں میں بیکراں مظلومیت کی جھلک اور ایک لمحے کے لمس نے برسوں کے غرور کو حقیر بنا دیا تھا۔

نعیم نے اسے ماتھے پر چوما اور آنکھوں پر اور گالوں پر اور ہونٹوں پر ایک ایک لفظ کے بغیر وہ بیتابی اور گرمجوشی سے اسے ساری جگہوں پر چومتا رہا حتیٰ کہ آنسوؤں کا نمکین مزہ اسے اپنی زبان پر محسوس ہوا۔

''مت روؤ۔'' وہ کوشش کر کے بولا۔ اس کی آواز خشک اور کمزور تھی۔ عذرا جھلملاتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''تم بیمار ہو۔'' اس نے دکھ سے پوچھا۔

''اب ٹھیک ہوں۔'' اس نے کہا اور اسے چھاتیوں کے اوپر چوما جہاں سے گلا کھلا ہوا تھا۔ ایک عمر گزر جانے پر بھی اس کے بیٹے کی جلد [illegible] اور [illegible] تھی۔ عذرا نے اس کے بالوں میں انگلیاں ڈال کر پہلی بار اسے چوما اور جذبے کی شدت سے دوبارہ رونے لگی۔

''مت روؤ۔'' نعیم نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دہرایا۔

بمشکل اپنے آپ پر قابو پا کر اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔ نعیم کی ماں ہاتھ میں سرخ رنگ کے تیل کا برتن لئے دروازے [illegible] اس نے پہچان لیا اور سادہ پرمعنی ہنسی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ وہ احتیاط سے آ کر چارپائی پر بیٹھ گئی اور بیٹے کی ٹانگ پر مالش کرنے لگی۔ اس کی آمد کو کسی نے محسوس نہ کیا۔

''تم پھر جیل گئے تھے؟'' عذرا نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''کتنی دیر؟''

''بہت دیر۔'' وہ محویت سے اسے دیکھتا رہا۔ ''کئی سال۔''

''تمہارے بال گر رہے ہیں۔''

''ہاں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

عذرا ہولے سے ہنسی۔ نعیم بھی اس کے ساتھ ہنسا۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھ رہا تھا۔ وہ محض اس برسوں کی گم شدہ محبوب آواز کو سننے میں کھویا ہوا تھا جو آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ اسے واپس مل رہی تھی جیسے آدھی رات کے ملاحوں کا گیت جو ابھی قریب آتا ہے اور ابھی دور چلا جاتا ہے اور کہیں نظر نہیں آتا لیکن مسافروں کی ہمت بڑھاتا ہے اور طوفانی راتوں میں انہیں زندگی کی محنت اور خوشی کا یقین دلاتا ہے۔

پھر عذرا نے نعیم کی ماں کو دیکھا اور گہری طرح جھینپ گئی۔ ''میں تیل ملتی ہوں۔''

''نہیں۔'' نعیم نے اسے پکڑ رکھا۔ ''تم باتیں کرو۔''

''باتیں بھی کریں گے۔'' وہ ہنسی اور اٹھ کر پائنتی بیٹھ گئی۔

''اچھا اچھا۔'' نعیم کی ماں بے فن' معنی خیز انداز میں ہنستی ہوئی باہر نکل گئی' پھر صحن میں سے لوٹی اور آ کر دروازہ بند کر دیا۔ اس کا سفید سر تیزی سے ہل رہا تھا۔

عذرا اس کی پنڈلی پر تیل ملتی اور ہولے ہولے باتیں کرتی رہی۔ اپنی باتیں' اس کی باتیں' اس کی بائیں ٹانگ کی باتیں جس پر فالج کا اثر تھا۔ نعیم گہری محویت سے سنتا اور اس کے کہنے پر اپنے جسم کے نیم مردہ حصے کو ہلانے کی کوشش کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ وہ اس سحر میں سے نکل آیا۔

کمرے کے وسط میں بجھتی ہوئی آگ کا آخری شعلہ کمزوری سے بھڑک رہا تھا۔

''اور لکڑیاں ڈال دو۔'' اس نے کہا۔

عذرا نے اٹھ کر خشک لکڑی آگ پر پھینکی۔ لکڑی نے دھواں چھوڑا اور بھڑاک سے جل اٹھی۔ عذرا کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ کمرے میں لکڑی کے جلنے اور مالش کے تیل کی ملی جلی بو پھیل رہی تھی اور دیوار پر عذرا کا سایہ ناچ رہا تھا۔

''چاچا مر گئے۔'' نعیم نے بھاری آواز میں کہا۔

''ہاں۔''

''ہاں۔''

دونوں خاموش ہو گئے۔

''میں جیل میں تھا جب مجھے اطلاع ملی۔ وہ میرے جیل جانے پر سخت خفا تھے۔ کئی بار میں نے پیغام بھیجا کہ آ کر مل جائیں لیکن نہ آئے۔ انہوں نے کہا: ''نعیم سے جا کر کہہ دو میرا اس کا کوئی تعلق نہیں رہا' میں اس کے بغیر آسانی سے رہ سکتا ہوں' مجھے اس بات کا دکھ ہوا۔ اس کے بعد میں نے کوئی پیغام نہ بھیجا۔ پھر وہ بیمار پڑ گئے۔ مجھے لوگوں نے آ کر بتایا کہ ان کا علاج ہوتا رہا' شدید تکلیف کے باوجود وہ بیماری کو صبر سے برداشت کرتے رہے۔ انہوں نے کسی کا نام نہ لیا' کسی سے ملنے کی خواہش ظاہر نہ کی۔ پھر ایک روز اچانک انہوں نے ملازم کو اپنے پاس بلایا اور بولے: ''تم سمجھتے ہو مجھے کسی شے کی حاجت نہیں رہی؟ تم غلط سمجھتے ہو۔ کل ہم الموڑے جا رہے ہیں۔'' پھر انہوں نے تاسف سے کہا: ''مجھے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ موت ہمارے بس میں نہیں ہے۔ زندگی میں اتنی کم مہلت ملتی ہے اور ہم اتنی غلطیاں کرتے ہیں۔ نعیم بھی اور میں بھی۔ عمر بھر ہم ایک دوسرے سے بچوں کا سا سلوک کرتے رہے ہیں۔ ضدی اور جاہل بچوں کا سا۔''

''لیکن اس رات وہ مر گئے۔'' نعیم نے سر اٹھایا۔ ''سنو۔ اس کے چند روز بعد میں نے خواب دیکھا کہ میں دریا کے کنارے کنارے جا رہا ہوں اور میں چلتا گیا چلتا گیا کہ ایک جگہ پر وہ دریا کی سطح پر ابھرے اور بولے:

UrduPhoto.com

"آگے جاؤ۔" میں پھر چلنے لگا۔ وہ ڈبکی لگا کر غائب ہو گئے۔ پھر تھوڑے فاصلے پر وہ پانی میں سے باہر نکلتے اور مجھے آگے جانے کا اشارہ کرتے رہے۔ پھر دریا ختم ہو گیا اور وہاں پر وہ ریت پر کھڑے تھے۔ دھوپ بڑی چمکیلی تھی اور ان کے سفید بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہ اپنا دلپسند سفید سوٹ پہنے ہوئے چھڑی ہاتھ میں لئے جیسے میرا انتظار کر رہے تھے۔ کہنے لگے۔ "میں اکیلا چل رہا تھا' اچھا ہوا تم آ گئے۔ ہم ریت پر چلنے لگے اور ہمیں راستے میں آبی پرندوں کے غول ملے جو اڑتے ہوئے سمندر کی جانب جا رہے تھے۔ چلتے چلتے ہم ایک مکان میں داخل ہوئے۔ وہ جگہ' گو کہ میں کبھی وہاں نہیں گیا ہوں' مجھے بے حد مانوس معلوم ہوئی۔ ہم سیڑھیاں چڑھنے لگے اور چڑھتے گئے چڑھتے گئے حتیٰ کہ میں ہانپنے لگا۔ وہ بیشمار تھیں۔ آخر میں ایک زینہ آیا اور ایک لوہے کا جنگلا جو مکان کے گرداگرد چلا گیا تھا۔ وہاں ریلنگ کے سہارے ایک مفلس اور شکستہ حال شخص بیٹھا تھا۔ اس نے خاموشی سے ہماری طرف دیکھا۔ چچا نے اپنی چاندی کی چھڑی میرے ہاتھ میں پکڑا دی اور کہنے لگے: "اسے دو۔" اس نے چھڑی میرے ہاتھ سے لے لی اور اس کے اداس چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ خاموشی اور احسان مندی سے ہمیں دیکھ کر ہنستا رہا پھر چھڑی کے سہارے اٹھا اور ریلنگ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اسے چلتے ہوئے دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ اب تک یاد ہے کہ میرے دل کی بے چینی اچانک ختم ہو گئی تھی۔ چچا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ہم واپس لوٹے۔ میرے دل میں مکمل اطمینان تھا اور خوشی جو اطمینان سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن سیڑھیاں اترتے اترتے وہ کہیں [illegible] تا رہا پھر ایک جھروکے سے باہر دیکھنے لگا۔ باہر ہر طرف زرد دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ریت پر اور سمندر پر اور آسمان پر زرد' بہت زرد۔" اس نے بولتے بولتے عذرا کا ہاتھ دبایا۔ "اور یہ خواب جو میں بتانے والا ہوں بے حد عجیب ہے۔ اس وقت جھروکے سے باہر دیکھتے ہوئے میرے دل میں عجیب سی اداسی پیدا ہوئی' بڑی گہری اور خاموش غمناک اداسی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اس سے میری پہلی خوشی اور طمانیت کو کوئی زک نہ پہنچی۔ میرے دل میں وہ بیزار کر دینے والی بے چینی پیدا نہ ہوئی۔ یہ کوئی اندوہناک جذبہ نہ تھا بلکہ ایک دھیما اور چھا جانے والا غم تھا' جیسے میں... جیسے... پتا نہیں۔ لیکن آج تک میں نے خواب میں کوئی جذبہ اتنی شدت سے محسوس نہیں کیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ چچا سے مجھے کتنی گہری محبت تھی' کہ ان سے میں اپنے باپ کی نسبت کہیں زیادہ وابستہ تھا' کہ زندگی میں اطمینان حاصل کر لینے کے بعد ہمارے لئے کچھ بھی نہیں رہ جاتا سوائے غم کے..... تمہیں علم ہے عذرا کہ چچا دنیا میں کس قدر تنہا تھے' کس قدر محنتی' کس قدر دکھی اور کس قدر نیک دل تھے۔ انہوں نے اتنے پیار سے مجھے پالا۔ زندگی میں اتنی لمبی تنہائی کا دکھ اٹھایا....." ایک سانس بولتے رہنے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور ماتھے کی رگ ابھر آئی تھی۔ عذرا نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں بڑی عجیب و غریب تھیں۔

"خالہ بھی فوت ہو گئیں۔" اس نے چپکے سے کہا۔

"ہاں۔ سنا تھا۔"

UrduPhoto.com

''ایسا ہوا نعیم کہ ...... اوہ ...... اس رات میں دیر تک جاگتی رہی تھی۔ میری ذہنی حالت کچھ اچھی نہ تھی۔ آدھی رات گزر جانے پر وہ میرے کمرے میں آئیں اور مجھے دیر تک جاگنے اور بارش میں بیٹھے رہنے پر ملامت کرنے لگیں۔ مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے انہیں واپس چلے جانے کو کہا۔ اس بات کا انہیں بہت رنج ہوا۔ وہ رونے لگیں' پھر اپنی بلی کو اٹھا کر باہر نکل گئیں۔ صبح جب ہم جاگے تو وہ مر چکی تھیں۔ آج تین سال سے اوپر ہو گئے۔''

نعیم کے چہرے پر تکدر کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ کافی دیر تک کشمکش کے بعد اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور آہستہ سے بولا: ''لیکن اب وہ مر چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں معاف کرے۔''

عذرا نے محسوس کیا کہ خالہ کے متعلق نعیم کے دل میں کوئی شدید غلط فہمی موجود تھی۔ پھر اس نے چپکے سے دل میں کہا: ''کیا فرق پڑتا ہے۔''

آگ پھر بجھ رہی تھی۔ عذرا نے اٹھ کر چند خشک لکڑیاں آگ پر ڈالیں اور دروازہ کھول دیا۔ جب سارا دھواں نکل گیا اور کمرہ تازہ و خشک ہو گیا تو اس نے دروازہ بند کر دیا اور دونوں ہاتھ نعیم کے سینے پر رکھ کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں روشنی اور حرارت آہستہ آہستہ بڑھنے لگی اور وہ ایک جلتی ہوئی چنگی لکڑیاں سوں سوں کی آواز پیدا کرنے لگیں۔

''تم مجھے یاد کرتے تھے؟''

''[illegible] تھی۔ جیل میں بھی' باہر بھی۔ دن بھر تو میں کام میں مصروف رہتا لیکن رات کے وقت جب میں اکیلا اور تھکا ہوا ہوتا تو نیند کہیں غائب ہو جاتی۔ اس وقت بڑی خطرناک باتیں میرے ذہن میں آتیں اور مجھے خیال ہوتا کہ دل و دماغ کے تمام عارضے مجھ کو لاحق ہو گئے ہیں۔ میری آنکھوں میں سے آگ نکلنے لگتی اور جسم پرانے بیماروں کی طرح کھلنے لگتا۔ ایسی ہزاروں راتیں میں نے گزاری ہیں۔ کئی بار یہ سوچ کر میں خوفزدہ ہو جاتا تھا کہ تمہارے بغیر شاید میں مر جاؤں گا۔'' وہ ہنسا۔

عذرا نے بے تابی سے اس کا گلا کھول کر بھیڑ کی طرح منہ اس کے سینے پر رگڑا۔ ''تم اتنا یاد کرتے ہو گے۔ میں نے کبھی نہ سوچا تھا۔'' وہ دوبارہ رونے لگی۔

''چپ رہو۔'' نعیم غرایا۔

اس نے نعیم کے کندھے پر رگڑ کر آنکھیں خشک کیں۔ ''دیکھتے ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ یہ سب کچھ گزرا ہے۔ تم نے یہ سب چھپایا ہے۔ تم نے مجھے یاد رکھا ہے۔ تمہاری آنکھیں بوڑھی ہو گئی ہیں۔ مجھے معاف کر دو۔''

وہ رنج سے مسکرایا۔

عذرا پھر بولی: ''مگر اس کے باوجود تمہاری آنکھیں خوبصورت رہی ہیں۔ یہ ایسا عجب لگتا ہے نعیم' تمہاری آنکھیں۔ بوڑھی اور نرم و نازک۔''

''یہ اس لئے ہے۔'' نعیم نے بیتابی سے کہنا شروع کیا۔ ''کہ جب میں اس بے پایاں رنج میں گھرا ہوا تھا